انوارِ شمسؔ

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمسؔ، کراچی، پاکستان

(۱) ظہورِ قدسی

حضرتِ آدمؑ کے انکار سے ابلیس مقامِ قدسی سے نکلا، بزم ملائکہ سے خارج ہوا نگاہِ قدرت سے گرا اور ہمیشہ کے لئے ملعون قرار پایا۔ اس نے بھی ٹھان لیا کہ آدمؑ اور ان کی اولاد کو چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ آخر آدمؑ کو جنت سے نکلوا کے دم لیا۔ دنیا میں بھی چین سے نہ رہنے دیا، فراقِ حوا میں سرگرداں وگریاں رکھا، ہابیل کو قابیل سے قتل کرادیا، نوحؑ پر پتھر برسوائے، دنیا پر عذاب نازل کرایا، ابراہیمؑ کو آگ میں ڈلوایا، عاد وثمود کو برباد کیا، لوط کی امت کو ہلاکت میں مبتلاء کیا، زکریا پر آرا چلوایا، موسیٰؑ کے پیچھے فرعون کو لگایا عیسیٰؑ کو سولی تک کھینچ کے لایا۔ نیکیوں کا آفتاب ڈوبا، جہالت کی تاریکی پھیلی، قتل وغارت کا دور آیا فسق وفجور کی جوانی نکھری، ظلم وستم کی حکومت قائم ہوئی، انسانیت مردہ اور شرافت فرسودہ ہوئی، ہمدردی خلق، ایثار معدوم ہوگیا...... علم بزدلی، صبر کمزوری، صنم خدا، کعبہ بتخانہ بن گیا۔ مصر، ایران، ہندوستان، یونان قدیم تہذیب وتمدن کے مراکز وحشت وبربریت کے طوفان میں بہ گئے اور پہنائے عالم میں شیطان رقص کناں تھا کہ عدل خداوندی متقاضی ہوا۔ دریائے رحمت نے جوش مارا اور اس ماہ میں آفتاب نبوی بطن آمنہ سے طالع ہوا۔ رحمت الٰہی نے آغوش میں لے لیا عظمت وجلال کبریائی نے چتر لگایا۔ آدمؑ کا علم نوحؑ کی ہیبت، ابراہیمؑ کی خلت، داوٗدؑ کی قوت، سلیمانؑ کی شوکت، موسیٰؑ کی مناجات، عیسیٰؑ کا زہد، ایوبؑ کا صبر، یوسفؑ کا حسن، گرد پھرنے لگا۔ شیطان چیخ اٹھا، قیصر وکسریٰ کے کنگرے زمین پر اتر آئے، بحیرہ ساوا ہوا ہو کے بلند ہوا۔ فارس کا آتشکدہ حرارت چھوڑ کے الگ ہوگیا۔۔۔ گویا اربعہ عناصر نے کروٹیں بدل کے تعمیر کا اشارہ کیا ایام رضاعت سے معجزات کا ظہور شروع ہوا۔ بچپنے ہی سے بلند کرداری کا سکہ چلنے لگا۔ جوانی میں سنگِ اسود کی تنصیب نے اصابتِ رائے اور حلف الفضول نے انسانی ہمدردی کا نقش دلوں پر بٹھادیا۔ پختہ عمری میں غارِ حرا میں وحی آسمانی نے علم لدنی کا تاج سر پر رکھ کر، جس کے کنگروں سے نورِ عرفانی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔۔۔ حلم ووقار، سخاوت وایثار، زہد وقناعت، علم وشجاعت کی زرہ زیب جسم کی، خلق عظیم کی تلوار ہاتھ میں دی، جس سے خون کی بوندوں کے بجائے آبِ حیات کے قطرے ٹپک رہے تھے ۔۔۔۔ نصرتِ خداوندی ہمرکاب ہوئی۔ وانذر عشیرتك الاقربین کے نقارہ پر چوٹ پڑی، نقیبِ فاتوا بسورة من مثله نے صدائے هل من مبارز بلند کی، گرد راہ چشم بصیرت کا سرمہ بنی، انسانیت کے جسد مردہ نے کروٹیں بدلیں اور مقبروں سے دل دھڑکنے کی صدا آنے لگی۔

وہ قوم جو قبیلوں میں منقسم اور باہم متحارب تھی، برادری اور برابری کے رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو کے ایک مرکز پر آگئی اور انسانیت کی علمبردار بن کر ساری دنیا کو اخوت ومساوات کا سبق

دینے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، پہاڑوں کو پھاندتی، میدانوں کو لپیٹتی، سمندروں کو روندتی دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک پہنچ گئی۔ کبھی اس کی تکبیر کی آواز افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں سے سنی گئی، کبھی اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بحرِ ظلمات سے اور کبھی سومناتھ سے آئی۔۔۔اور وہ قوم جو بت گر تھی بت شکن، جو غلام تھی شہنشاہ بن گئی۔اور جہالت کی تاریکی سے نکل کر چار دانگ عالم میں علم کی شمعیں لے دوڑی اور وہ نور جو فاران کی چوٹیوں پر چمکا تھا، ہمالیہ کی چوٹیوں سے برسنے لگا اور سارا عالم جگمگا اٹھا۔

❀❀❀

(۲) تخلیق غنا کا فلسفہ اور اس کی شرعی حیثیت

صنعتِ غنا: موسیقی فلسفیوں کی ایجاد ہے۔انسان کے ذہن سے جتنی آوازیں نکلتی ہیں، ان میں سے سات آوازوں سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی کو منتخب کرنا اور ان کی تالیف سے نغمات پیدا کرنا اور ان میں زیر و بم سے جان ڈالنا فلسفیوں کے سوا اور کسی سے ممکن نہیں۔یونان میں اس وقت تک کوئی فلسفی کامل نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک وہ موسیقی میں بھی کمال حاصل نہ کرلے۔

مسلم فلاسفہ میں ابوالنصر فارابی، جو ارسطو کے نام سے معلم ثانی کہا جاتا ہے، اعلیٰ درجہ کا موسیقار اور الغوزہ کا موجد ہے۔

ہندوستان میں امیر خسرو ایسا علامۂ روزگار اور صوفی صافی طینت موسیقی میں ایسا کامل تھا کہ ہندوستانی اور عجمی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئی موسیقی ایجاد کی اور بہت سے راگ ایجاد کئے۔جیسے پروا، غالا، زیلف وغیرہ۔

غایتِ غنا: فلاسفہ کہتے ہیں کہ غنا لحنِ موزوں ہے۔ اگر یہ اپنی صنعت میں کامل ہے تو دلوں میں اتر جاتی ہے، بات کے اثر کو بڑھا دیتی ہے اور وجد کا عالم طاری کردیتی ہے۔ دلوں کے مخفی رازوں کو باہر نکال دیتی ہے، اخلاقِ فاضلہ سے نزدیک اور اخلاقِ ذمیمہ سے دور کردیتی ہے۔افلاطون موسیقی کی تعلیم کو لازمی قرار دیتا ہے۔اور لکھتا ہے کہ اس سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے، طبیعت میں موزونیت پیدا ہوجاتی ہے، سکونِ قلب بڑھ جاتا ہے اور انسان اخلاقِ فاضلہ سے قریب ہوجاتا ہے۔

روایتِ غنا: یونان میں مندروں کے اندر گانا ہوتا تھا۔ قدیم ہندوستان کے مندروں میں عورتیں معرفت کے ترانے گاتی تھیں، جن سے جذباتِ معرفت بھڑک اٹھتے تھے۔لوگ وجد میں آکر جھومنے لگتے تھے اور یہ بڑی عبادت سمجھی جاتی تھی۔ہندوستان کے مندروں میں اب بھی بھجن گائے جاتے ہیں۔پیغمبرِ اسلام جب ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو انصار کی لڑکیاں **طلع البدر علینا**، کا ترانہ گاتی ہوئی گھروں سے باہر نکل آئیں اور پیغمبرؐ خدا نے انھیں منع نہیں کیا، کیونکہ یہ ان کے عقیدت واحترام کے جذبات تھے، جنھوں نے غنا کی شکل اختیار کرلی تھی۔یہ بڑی عبادت تھی۔

خاتونِؑ جنت جب رخصت ہوکے علیؑ کے گھر جانے لگیں تو ان کی سواری کے آگے جوانانِ ہاشمی تلواریں علم کیئے ہوئے تھے اور عقب میں ازواج رسولؐ زنانِ ہاشمیہ اور انصار ومہاجر کی خواتین خوشی کے ترانے گا رہی تھیں اور خدا کا رسولؐ ساتھ تھا۔اس زمانۂ عرب میں موسیقی اسی حد تک تھی۔حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اس کو ترقی ہوئی۔

غنا عبادت ہے: صوفیائے کرام اس کو غذاء روح کہتے ہیں اور معرفت کے ترانے ان کے جذباتِ معرفت کو بھڑکا دیتے ہیں اور وجد وحال کی کیفیت طاری کردیتے ہیں۔کوئی جھومنے لگتا ہے اور کوئی ہو، حق کرنے لگتا ہے اور کسی کی آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں اور کوئی رقص کرنے لگتا ہے۔

۱۷۷۱ء کا واقعہ ہے کہ سماء الدین ایک محفل سماع میں معرفت کے ترانے سن رہے تھے، غش آگیا اور اسی حال میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

۱۹۷۰ء میں مولانا ابوالفتح ایک محفلِ سماع میں بیٹھے تھے۔ مغنی غزل گا رہا تھا جب اس نے یہ شعر گایا

جاں بجانا دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ان نکو یا ان نکو

مولانا پر وجد وحال کی کیفیت طاری ہوگئی اور ان نکو یا ان نکو کی تکرار کرتے ہوئے جان سپردجاناں کردی۔ (نزہت الخواتر)

اس سے بڑھ کر کوئی اور عبادت کیا ہوسکتی ہے، جو انسان کو واصل بحق کردے۔ بیشتر علماء شادی کے موقع پر جوازِ غناء کے قائل ہیں، اور بعض علمائے شیعہ بھی معرفت کے ترانوں کو جائز سمجھتے ہیں۔

حرمت غنا: جو علمائے شیعہ حرمت غنا کے قائل ہیں ان کے پاس قرآن وحدیث سے کوئی نص نہیں ہے۔ اس کو علماء نے زور اور لہوولعب میں داخل کرکے حرام قرار دیا ہے اور بعض احادیث سے یہی ظاہر ہوتا ہے، لیکن جو غنا معرفت کے ترانوں پر مشتمل ہے، جس سے جذبات معرفت بھڑک اٹھتے ہیں، ان کے جواز میں کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اس کو بہترین عبادت سمجھنا چاہیئے۔

❁❁❁

(۳) مولوی عبدالحق اور مقدمۂ باغ وبہار

مولوی عبدالحق صاحب (سکریٹری انجمن ترقیٔ اردو) جو اردو دانی اور اردو نوازی میں بڑی شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ مقدمہ باغ وبہار میں لکھتے ہیں۔

> ''عام پڑھے لکھے لوگ بھی شاعر ہی کی زبان کو زبان مانتے ہیں۔ لغت نویسوں نے بھی اکثر انہیں کی پیروی کی اور دیوانوں کو ٹٹول کر الفاظ اور محاورے جمع کردیئے۔ بہت لفظ یوں ہی پڑے رہ گئے اور کسی نے خیال بھی نہ کیا اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو آڑے وقت پر کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کرسکتے، گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جائے۔''

اس عبارت میں دیوانوں کو ٹٹولنا محاورہ کا بےمحل صرف ہے۔ بصارت نہ ہونے یا بصارت سے کام نہ لے کے کسی چیز کو ڈھونڈھنا، ٹٹولنا کہا جاتا ہے۔ اندھا راستہ ٹٹولتا ہے، اندھیرے میں چیز ٹٹولی جاتی ہے۔ ٹٹولنے اور ڈھونڈھنے میں بھی فرق ہے کہ ڈھونڈھنے والا آنکھ سے دیکھ کے عقل کے سمجھ سے کام کرتا ہے اور ٹٹولنے والا اندازہ سے۔ دیوانوں سے لفظوں اور محاوروں کو جمع کرنا اندازہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس میں بصارت و بصیرت (دونوں) سے کام لینا پڑتا ہے، جس کو ٹٹولنے سے تعبیر کرنا منشائے بلاغت کے خلاف اور محاورہ کا غلط استعمال ہے۔ پھر لطف یہ کہ ٹٹولا دیوانوں کو، ملیں لفظیں۔۔۔ ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ۔ اس سے بھی زیادہ پرلطف یہ عبارت ہے۔

> ''اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو آڑے وقت پر کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کرسکتے، گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جائے۔''

آڑے وقت پر کام آنا، ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں آنے والی مصیبت کو روک لینا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ مصیبت میں سپر بن جانا۔ مثلاً کوئی مصیبت آنے والی ہو اور رک جائے تو کہتے ہیں کبھی کی نیکی تمہارے آڑے وقت کام آ گئی یا کسی کی وجہ سے کوئی بلا ٹل جائے تو کہتے ہیں فلاں تمہارے وقت پر کام آ گیا۔ اس محل پر ''آڑے وقت پر کام آنا'' ایک مہمل بات ہے اور صرف محاورہ استعمال کرنے کے شوق یا اردو دانی کی نمائش نے قلعی کھولی ہے۔

یہ تو تھے محاورے، اب لغت دانی کا حال ملاحظہ فرمایئے۔ اسی کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ ہے، جس سے اردو دانی میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً

اوقچہ: اس کے معنی لکھے ہیں پلنگ پوش یا بالا پوش۔ اوقچہ

ایک پٹی ہے، جوعرض میں تخت، پلنگ یا مسہری کے پایوں کے برابر ہوتی ہے اور طول میں چاروں پایوں کو گھیر لیتی ہے۔ پلنگ پوش اس کے علاوہ ہے۔

بجھڑا: کوزہ، آبخورہ۔ اس کا املا بھی غلط ہے۔ بجائے ہائے مخلوط کے، ہائے ہوز (بجہرا) ہونا چاہیئے اور معنی بھی غلط ہیں۔ یہ نہ آبخورہ، نہ کوزہ بلکہ گھڑے کا ڈھکنا ہے، جس میں اوپر ڈنڈی لگی ہوتی ہے۔

خوردکام کرنا: ٹکڑے کرنا، چورا کرنا۔ اس کے معنی ہیں زدوکوب کرنا، مارنا پیٹنا یہ مشتے نمونہ ہے۔

❀❀❀

(۴) لکھنؤ کا تمدن

تمدن انسانیت کا معیار ہے۔ جتنا تمدن ترقی کرتا ہے، انسانیت نکھرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بلند تمدن کو کم متمدن افراد فوراً قبول کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اسے انسانیت کی زینت سمجھتے ہیں۔

ایران کا تمدن ساری دنیا سے قدیم اور فائق ہے۔ جب بہت سے متمدن ممالک وحشیوں کے ملک تھے، اس وقت ایران کے لوگ بوقلموں لباس پہنتے تھے۔ قانون فطرت ہے کہ حکمرانوں کا تمدن محکوم اختیار کرتے ہیں۔ ایران کے تمدن کی بلندی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ عربوں نے ایران کو فتح کیا، لیکن ان کے تمدن کے آگے مفتوحانہ سر جھکا دیا۔

نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا میں، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کی تہذیب کا، ایران کی نقالی پر انحصار ہے۔ لکھنؤ کے تمدن کو سمجھنے کے لئے پہلے ایران کے تمدن کو سمجھنا چاہیئے۔

ایران کے تمدن میں اس کشش و برتری کی وجہ وہ جغرافیائی اور طبعی خصوصیتیں ہیں، جو اہل ایران کو تمام دنیا سے ممتاز کرتی ہیں اور وہ پانچ ہیں۔ نفاستِ طبع، شاعرانہ ذہنیت، حسن پرستی، پھولوں کا شوق اور ذہانت۔ یہ باتیں کم یا زیادہ، دنیا بھر میں پائی جاتی ہیں، مگر ایرانیوں میں اس شدت سے ہیں کہ ان کی معاشرت میں ابھرا بھر کے اپنے وجود کو ظاہر کرتی ہیں اور نگاہیں فوراً ان کو دیکھ لیتی ہیں۔

نفاست کو یوں سمجھیئے کہ بدصورت چیز کو نفیس نہیں کہتے ہیں۔ جس میں صفائی نہ ہو، وہ نفیس نہیں۔ ٹیڑھی بکلی اور بدقوار چیز نفیس نہیں۔ بھونڈی اور بھدی چیز کو نفیس نہیں کہا جاتا، جس میں چھچھورا پن ہو وہ نفیس نہیں۔ حسن، نزاکت، صفائی، سب کچھ ہونے کے بعد اگر رنگ شوخ یا متعدد ہوں تو اسے شوخ نہیں کہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وضع قطع، رنگ وروپ، ہر حیثیت سے خوبصورت اور بے عیب چیز کو نفیس کہتے ہیں۔

جس کی فطرت میں نفاست ہوتی ہے، اس کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، زبان اور خیالات میں بھی نفاست ہوتی ہے اور زندگی کے کسی شعبہ میں وہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں، جنھیں ہم کہیں بھونڈا پن، کہیں ابتذالی، کہیں چھچھورا پن، کہیں بے سلیقگی، کہیں بازاریت، کہیں بدصورتی کہتے ہیں۔ اہل ایران کا یہی حال ہے۔

1954ء میں عراق کے راستہ سے میں ایران گیا۔ ایک ایرانی ہمارے ہمسفر تھے۔ اتفاق سے بس میں ہم اور وہ ایک سیٹ پر بیٹھے۔ کھڑکی کی طرف وہ تھے۔ جب انھیں جانا ہوتا تھا تو پہلے اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لیتے، اس کے بعد ہمارے زانو کو نانگھتے اور پھر جوتا پہنتے۔ اسی طرح آتے وقت وہ زحمت اٹھاتے۔ میں نے ان سے کہا کہ تکلیف کی کیا ضرورت ہے، مگر انھوں نے گوارا نہیں کیا۔ اس سے پہلے کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور ایک دوسرے سے بےخبر تھے۔ اب میں نے ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ ''آقائے علی نقی'' فلسفی کے بھائی ہیں اور میرے متعلق انھیں ایک پاکستانی مسافر ہونے کا علم ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کے ساتھ ان کا یہ مہذب برتاؤ انسانیت کا احترام تھا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔

غروبِ آفتاب کے قریب ہم عراق کی سرحدی چوکی خانقیں پہنچے۔ وہاں آمد ورفت کو دخول وخروج سنا۔ وہاں سے

چل کر تین، چار کوس پر ایران کی سرحدی چوکی مورد خسروی میں صدور وخروج سننے میں آیا اور ایرانیوں کی پاکیزگی ذوق کا اندازہ ہوا۔ صدور وورود بھی عربی لفظیں ہیں اور دخول وخروج میں بھی جو ذم کا پہلو ہے، وہ بھی عربوں کے استعمال کے موافق ہے۔ مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوا، جبکہ وہ آسانی سے ورود یا صدور کہہ سکتے تھے۔

اب ایران میں ہمارا سفر شروع ہوا۔ جس چیز نے سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا، وہ نہروں، آبشاروں، درختوں، پھولوں اور سبزوں کی افراط تھی۔ راستوں، گلیوں چوراہوں پر ایک دائرہ میں سبزہ، درخت، پھول اور حوض نظر آیا۔ حوض پر ایک چھوٹی سی تختی پر لکھا ہوا تھا ''نظافت رامراعات دارید'' (صفائی کا لحاظ رکھیئے)۔ ہم نے کسی کو حوض پر منہ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے نہیں دیکھا۔ پانی الگ لے جا کر منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ اس سے جہاں ملک نہروں، آبشاروں، درختوں اور پھولوں سے بہشت نظر آیا، وہاں اس کے باشندوں کی طبعی نفاست کا اندازہ بھی ہوا اور یہی وہ چیز ہے، جس نے ان کے معاشرے کو ساری دنیا سے ممتاز کیا ہے۔

ہر گھر میں قدرتی نہر کی ایک پتلی سی شاخ گذرتی ہے، جس سے ہر وقت سرد وشیریں، صاف اور تازہ پانی ملتا ہے۔

گھر پھولوں سے بھرے ہیں، دیواروں پر بیلیں چڑھیں ہیں خانۂ باغ، پائیں باغ انھیں کی زبان کی لفظیں ہیں، جو ان کے تمدن کا آئینہ ہیں۔ راستے اور گلیاں پھولوں اور درختوں سے گلزار ہیں، رنگ اور پھول ان پر برس رہا ہے۔ قالین پر بیل بوٹے، دروازوں پر پھول پتیاں، اینٹوں پر گل بوٹے، مکان کی جالیوں میں پھول، زمین پر گلکاریاں (ٹائل) درودیوار پر نقش ونگار صنادید عجم کی یادگار ہیں۔ ان کی زبان میں رنگینی ہے۔ ان کی شاعری میں رنگ اور پھول سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آنکھ نرگس، چہرہ گلاب، جسم یاسمین، دہن غنچہ، لب برگِ گل، ہنسی خندۂ گل، قد سرو، زلف سنبل ہے۔ یہ استعارے ایران سے تمام دنیا میں پھیلے۔

مہندی، گلاب نرگس ایران کی خاص چیزیں ہیں۔

پنڈت برج موہن وتا تاریہ کیفی نے لکھا ہے:

''ہندوستان کے قدیم ہندو لٹریچر میں عورت کے سولہ سنگھاریں مہندی نہیں۔ یہ ہندوستان کی چیز نہیں، مسلمانوں کے ساتھ ایران سے آئی ہے۔

فارسی شاعری میں اس سے جتنے مضمون پیدا کئے ہیں، وہ کسی اور زبان میں نہیں۔ نرگس اور گلاب بھی وہاں کا خاص پھول ہے۔ نرگس کو کہیں اور کی آب وہوا راس نہیں آئی، اس لئے اس نے ایران سے باہر قدم نہیں نکالا۔ گلاب ہر جگہ پہنچا، مگر ایران میں اس کا جس طرح استعمال ہوا، کہیں نہ ہوسکا۔ وہاں اسے گل کہتے ہیں۔ تمام پھولوں کا سرتاج ہے۔ اس کا رنگ آنکھوں میں کھپ پاتا ہے۔ اس کی خوشبو شامہ کو معطر، دل میں سرور، آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ بلبل مست ہو کے چہکنے لگتی ہے اور اس کے قریب بیٹھ کے اس کی مستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رات رات بھر بولتی ہے۔

گلے کے ہار میں اس کا پیوند ہار کو بھاری بھرکم بنا دیتا ہے۔ گلدان میں دوسرے پھولوں کے ساتھ رعایا میں بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ شاعری میں تشبیہ واستعارہ ہے۔ اس کا عرق کھانوں کو معطر کرتا ہے، محفلوں کو بساتا ہے، مریضوں کی دوا ہے۔ زبان میں اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سیکڑوں مرکبات میں تنہا گل کے کئی معنی ہیں۔ گلابی کے کئی مفہوم ہیں۔ ہر اچھی چیز اس سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اچھی صورت گلرو، گل رخسار، گلعذار، گل چہرہ ۔۔۔ خوبصورت جسم گل اندام، گلبدن ۔۔۔ اچھا لباس گل پیرہن ۔۔۔ اچھی بات گلفشانی، گلپاشی، گلریزی ۔۔۔ اچھی آواز گلبانگ ۔۔۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کے سابقہ لاحقہ سے اتنے مرکبات ہوں۔

لاحقے: گلاب، گل آفتاب، گلابی، گل بو، گلباری، گلبرگ، گلبن، گل بیگانہ، گلبانگ، گل پاپوش، گل پاش، گلپوش، گل پیادہ،

گل تر، گل تراش، گل تسبیح، گلچیں، گلخن، گل خوردہ، گل صبح، گلدم، گل دام، گلدار، گل دوز، گل رعنا، گلرنگ، گل زمین، گلزار، گلستان، گل شمع، گل شکر، گلشن، گل صبح، گلفام، گلکار، گلقند، گل کدہ، گلبگوں، گلکوں، گلگونہ، گل میخ، گل مہتاب، گلنار، گل دوش، گلی۔

سابقے: برگِ گل، تبسم گل، خندۂ گل، عرق گل، غنچۂ گل، دامن گل، زرگل، بوئے گل، نکہتِ گل، شمیم گل، فصل گل، موسم گل، سبدگل، قبائے گل، جامۂ گل، رنگ گل، روغن گل، ساغر گل۔

محاورے: گل گفت، گل دیگر، گل شگفت، گلگشت، گل در آب کردن، گلدان، گلگل شگفت، گل خوردن۔

اب معلوم ہوا کہ وہ دنیا کو گلشن ایجاد کیوں کہتے ہیں۔ یہی عالم رنگ کا ہے۔ ہر اچھی چیز رنگین ہوتی ہے۔ رنگین نوا، رنگین سخن، رنگیں زباں، رنگیں بیاں، رنگین شعر، رنگیں ادا۔۔۔ بہت سے محاورے ہیں۔ رنگ بروئے اوردن، رنگ ریختن، رنگ زرن، رنگ بستن، رنگ شکستن، رنگ برآب ریختن، مالیدن، رنگ پوشیدن، رنگ خندیدن، رنگ برخاستن، رنگ گسیختن، رنگ گرداندن، رنگ جستن، رنگ، رنگ بردن وغیرہ۔۔۔ غرض رنگ وبو کا ایک سیلاب ہے اور دنیائے رنگ وبو اسی سے تعبیر ہے۔ اپنی شاعرانہ طبیعت سے روزانہ نئی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

خراسان میں ایک لڑکا دو گلدان ہاتھ میں لیئے بیچ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

ہم گل وہم گلدستہ۔ گلدستہ کے لئے ہم نے یہ فقرہ نہیں سنا تھا۔ ان کے طرزِ معاشرت میں جس نفاست اور سلیقہ کا اظہار ہوتا ہے، کہیں اور نظر نہیں آتا۔

اہل ایران کی ایجادیں: دنیا میں ہزاروں چیزوں کے وہ موجد ہیں اور اسی دورِ ترقی میں بھی ان کی بہت سی ایجادوں پر کوئی اضافہ نہ ہوسکا۔ جام وشراب، تخت وتاج، دربار اور اس کے آئین ساری دنیا نے ایران سے سیکھے۔ کافوری شمعیں، شمعدان اور فانوس ان کی نفیس طبیعت اور پر ایجاد ذہن کی پیداوار ہے۔

بیمارستان (اسپتال) دنیا میں سب سے پہلے ایران (جندشاپور) میں بنا اور طب یونانی وہیں سے ساری دنیا میں پھیلی۔ دنیا میں سب سے پہلی مشین ایرانیوں نے ایجاد کی۔ ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں لکھا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے آلۂ جرِ ثقیل، مشین گن (ایک راؤنڈ میں بارہ فائر کرنے والی بندوق)، قلعہ شکن توپ، ہوا سے چلنے والی چکی ایجاد کی۔

خط نستعلیق ایرانیوں نے ایجاد کیا۔ جب ایران میں عربی خط (نسخ) رائج ہوا تو اس کی ناہمواری اہل ایران کی نفیس اور حسن پرست طبیعت پر بار ہوئی۔ انھوں نے اس میں گول دائروں اور نوک پلک سے حسن پیدا کیا اور اس کا نام نسخ تعلیق رکھا کیونکہ وہ نسخ پر تعلیق تھی۔ ثقل کی وجہ سے خارج ہوگئی اور نستعلیق رہ گیا۔ پھر اس میں جدتیں پیدا کیں اور اس کی بہت سی قسمیں ایجاد کیں خط گلزار، خط غبار، خط ماہی، خط طغرا، خط ریحاں، خط شفیعہ وغیرہ اور ہر خط کو مضمون کی مناسبت سے استعمال کیا۔

نسخ کو بھی انھوں نے اس کی حالت پر نہیں چھوڑا، بلکہ اس میں بھی ایک حسن پیدا کیا، گویا اونٹ کو بنا سنوار کے حسین بنا دیا۔ قالین کی ایجاد بھی ان کی حسن کی حسن پسند طبیعت کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے جیسے قالین بنائے، دنیا میں کہیں نہ بن سکے۔ آج بھی وہ اعلیٰ تمدن کا اہم جزو ہے اور اس سے بہتر کوئی ایجاد اب تک نہیں ہوسکی۔ سفید فرش اور اس کا نام چاندنی نور جہاں کی اختراع ہے۔ عطر بھی اس کے حکم اور تجویز سے بنا۔ اس سے پہلے مشک رکھتے تھے۔ اور غالیہ (خوشبودار پوڈر) بالوں میں ملتے تھے۔

راستوں میں درخت میلوں کے نشانات اور کارواں سرائیں دنیا میں سب سے پہلے انھوں نے بنائیں۔ کھانے میں پلاؤ زردہ، قورمہ، کباب، شیر برنج ایسے نفیس کھانے انھیں کی ایجاد ہیں اور پلاؤ قورمہ ساری دنیا کے لئے مرغوب غذا بن چکا ہے۔

دہلی کا تمدن: ہندوستان میں جن بادشاہوں نے حکومت کی، وہ افغانستان وترکستان کے مغل اور پٹھان تھے، لیکن دربار اور اس کے آئین ''شان وشوکت''، ''رعب وداب''، ''تہذیب وتمدن''،

''نفاست وشائستگی''میں ایران کی نقل کرتے تھے۔حد یہ ہے کہ درباری اورسرکاری زبان ایرانی تھی،شعروشاعری ایرانی تھی۔

ایرانی کھانے دسترخوان کی زینت تھے،ایرانی اطباء، شعراء، فلاسفر،اہل قلم اور اہل سیف سے پایہ تخت بھرا ہوا تھا۔ ایران میں خط (نستعلیق) کی بہت قدر تھی۔ایران ولایت اور ایرانی ولایتی کہے جاتے تھے اور اس میں تمدنی،لسانی اور علمی عظمت و برتری کا مفہوم مضمر تھا، خاص طور پر مغلوں کے زمانہ میں تو وہی طبیب، منجم، شاعر، فاتح ملک، مدبر سلطنت، حکومت کے بانی،سلطنت کی شان اور ملک کا استحکام تھے۔ان وجوہ سے ہندوستان ایران سے ہر بات میں متاثر تھا اور اس کی نقل، تہذیب وشائستگی کا معیار تھی۔

ہندوستان کے قدیم تمدن میں ہاتھی کی سواری کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ شاندار سواری نہیں اور جامہ مختلف قسم کی پگڑیاں،مٹھائیاں،کھانے میں پوریاں، کچوریاں،دہی بڑے، پھلکیاں،مزیدار چیزیں تھیں۔ پان بھی یہاں کی خاص چیز تھی،جس سے منہ کسی وقت سیٹھا پھیکا نہیں رہتا اور اس کی سرخی کا ہونٹوں کے دریچہ سے جھانکنا گورے چٹے اور خوبصورت لوگوں کے حسن میں اضافہ کر دیتا تھا۔شعروشاعری،طب ونجوم میں بھی ان کی عظمت مسلم تھی۔ مسلمانوں نے ان سب کو اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کے بہت سے رواسم اختیار کر لیئے۔اس طرح ایک مخلوط تمدن قائم ہوا،جس کا غالب حصہ ایرانی تھا۔

ایران کے تمدن میں انقلاب: ایران کے تمدن میں بھی صفویوں کے زمانہ میں انقلاب آیا۔ شاہی رعب وداب، شان وشوکت، نفاست، پاکیزگی ذوق،حسن خلق، احترامی شجاعت، شعروشاعری سے دلچسپی تو باقی رہی صوفیت وامرد پرستی کا خاتمہ ہوا خانقاہیں ویران ہوئیں، اہلبیتؑ مرکزِ عقیدت بنے،تعزیہ داری،مجلس وماتم،نذرونیاز ہونا شروع ہوئی،علماء کی قدرومنزلت بڑھی، یہاں تک کہ سلاطین ان کے سامنے تخت وتاج پیش کرکے ان کی نیابت میں امورسلطنت انجام دیتے تھے۔،اپنی بیٹیوں کی شادی ان کے ساتھ کرنے میں فخرمحسوس کرتے تھے،شعراء کی قدرومنزلت میں بھی اضافہ ہوا۔

یہی زمانہ ہندوستان سے روابط بڑھنے کا تھا۔شاہ اسماعیل نے بابر کی اور شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی مدد کی،جس کے نتیجے میں ترکستان،افغانستان اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی۔ ایرانی علماء،شعراء اور اہل سیف کثرت سے ہندوستان آئے۔ ان کے ساتھ تعزیہ داری بھی آئی۔ بابر اور ہمایوں سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ دونوں خود بھی شیعہ ہو گئے تھے۔تعزیہ داری کا تعلق امام حسینؑ سے ہے اور صوفیائے اہل بیت سے عقیدت میں کسی سے کم نہیں ہیں،اس وجہ سے وہ بھی تعزیہ داری اور نذرونیاز عقیدت واحترام سے کرنے لگے۔آج تک اکابر صوفیاء کے مزاروں پر تعزیہ داری ہوتی ہے۔اس طرح ہندوستان میں صوفیت کے ساتھ تعزیہ داری کو فروغ ہوا۔اور فارسی اصناف سخن کے انداز پر اردو میں شاعری شروع ہوئی،جس میں مضامین،تشبیہ واستعارے،ترکیب وبندش،سب فارسی تھی۔

لکھنؤ کا تمدن: سید محمد امین (ایرانی امیرزادے) جوانی میں گھر سے خفا ہوکے ہندوستان آئے اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہت جلد بلندی پر پہنچ گئے۔۱۷۳۰ء میں اودھ کے صوبے دار ہوئے۔

وہ ایران میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں کی تہذیب میں پل کر جوان ہوئے۔ان کی معاشرت اور تہذیب ایران کی نقل نہیں، اصل تھی۔ وہی نفاست،شان وشوکت، تہذیب وشائستگی،شعروشاعری،علم وفن کی قدر،مجلس و ماتم ان کی فطرت بنی ہوئی تھی۔ اجودھیا کے قریب دریائے گھاگھرا کے بند پر انھوں نے ایک نیا شہر ایرانی طرز کا بسایا،جو بنگلے کے نام سے مشہور ہوا، کیونکہ وہ پھونس کے بنگلے میں رہتے تھے۔اس کی خصوصیت یہ تھی کہ سرِشام سے رات گئے تک ایرانی شہروں کی طرح اس کی چہل پہل بڑھتی تھی۔ رفتہ رفتہ پورے صوبے کی یہی حالت ہوگئی۔ دوسرے صوبوں کے بھی بعض مقامات کی شادی دیکھنے کے قابل ہوتی

تھی۔اس سے پہلے ہندوستان میں سرِ شام سے بازار بند ہوجاتے تھے۔اب بھی پاک وہند کے اکثر مقامات پر یہی ہوتا ہے۔

صفدر جنگ: اپنے بھانجے مرزا مقیم کو ایران سے بلوا کے اپنی لڑکی صدر جہاں بیگم سے شادی کی ۔وہ شاہی نسل سے تھے۔وہی نفاست اور شان وشوکت ان کی طبیعت میں داخل تھی۔اہل علم کے قدرداں اور آلِ رسول کے عقیدت مند تھے۔ یہ باتیں اس معیار پر دہلی کے نوابین میں بھی تھیں۔

میر تقی میرؔ نے لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانہ وزارت میں جس شان وشوکت سے رہتے تھے، وہ شان بادشاہ کی بھی نہیں تھی۔ بنگلے کو انھوں نے خوب سجایا اور اس کا نام فیض آباد تھا۔لکھنؤ جو اصل دارالحکومت تھا، اس میں بھی نئی عمارتیں بنوائیں اور پرانی عمارتوں کو درست کر کے شہر کو آراستہ کیا۔

شجاع الدولہ: شجاع الدولہ نے فوج کو ترقی دی، سپاہیانہ جوش وخروش بڑھا، اسلحہ کے کارخانے کھولے، اس پیشہ کے لوگ دور دور سے آئے۔ایرانی طرز کے باغ اور سیر گاہیں بنائی گئیں، تعزیہ داری کو فروغ ہوا۔علماء، اطباء اور شعراء کی قدر افزائی ہوئی اور اہل کمال سے شہر بھی بھر گیا۔شہر کی درستی اور خوبصورتی کا بھی بڑا خیال تھا اس کی حفاظت وہ خود کرتے تھے۔

وہ ایرانی ہونے کے ساتھ دہلوی بھی تھے۔ان کی ماں ایرانی نہ تھی ،لیکن ایرانی باپ کی بیٹیاں ضرور تھیں، مگر دہلی میں پیدا ہوئی تھیں، خود شجاع الدولہ نے بھی دہلی میں آنکھ کھولی۔

وہ دہلی کو اپنا وطن ثانی سمجھتے تھے اور سلاطین دہلی کے اکثر ذوق ان میں موجود تھے۔رقص وسرور، جانوروں کی لڑائی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔اربابِ نشاط سے دلچسپی کے ثبوت دور دور پہنچ گئے اور کشمیر سے حسین وجمیل طوائفیں آئیں اور کوچے ان سے بھر گئے۔کسی عورت کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔اس حکم میں طوائفوں پر پابندی مقصود تھی۔گو وہ اپنے کو قید نہ سمجھیں۔ اس کے لئے ان پر طرح طرح کی نوازشیں ہوئیں اور بغیر کسی خدمت کے انعام واکرام کا دستور قائم کیا کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں۔اس کے باوجود وہ محمد شاہ رنگیلے نہیں بنے۔

ان کے گھر میں ایرانی فضا تھی، جس میں انھوں نے پرورش پائی، اس وجہ سے وہ طبعاً ایرانی تھے۔ایرانی نفاست، شان وشوکت اور رکھ رکھاؤ ان میں موجود تھا۔نہایت رعب وداب سے رہتے۔طوائفوں سے اتنی دلچسپی کے باوجود انھیں اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ بے تکلف ہو کے ادب وتعظیم سے ہاتھ اٹھالیں۔نہایت ادب سے سامنے آتی تھیں، اس کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔اس سے معاشرہ میں اعتدال اور چھچھوراپن پیدا نہیں ہوسکا، بلکہ ادب تعظیم اور نفاست کا لحاظ بڑھ گیا۔

سپہ گری، اسلحہ سازی، خطاطی کو ترقی ہوئی۔تصنیف وتالیف کو بھی پوری ترقی ہوئی، چرچا بڑھا، نفیس ولذیذ کھانوں کا شغل پھیلا۔

شیعہ سنی کی تفریق نہ تھی۔شیخ سدو کا بکرا میران جی کے گلگلے میں، احمد کبیر کی گائے ،بابا فرید کا کونڈا ،امداد صاحب کی کندوری، غازی میاں کا جھنڈا ،عرس ،قوالی ، چادر، گاگر، مذہبی رواسم تھے۔نکاح، طلاق ،دفن ،کفن ،سب ہی اہلسنت کے طریقہ پر ہوتا تھا۔جمعہ اور عیدین کی نماز شیعہ اہل سنت کے ساتھ پڑھتے تھے، کیونکہ شیعہ عالم نہ تھا۔شیعوں کی کوئی مسجد نہ تھی نہ امام باڑہ۔محرم میں کپڑے یا پھونس کا امام باڑہ تھا اور دس دن بعد غرباء لے جاتے تھے۔

آصف الدولہ: آصف الدولہ نے باون گاؤں ملا کے لکھنؤ کو وسیع کیا اور پھر نئے طرز کے چار سو باغ بنوائے ،جس کی وجہ سے لکھنؤ کو انگریز ''ہندوستان کا باغ'' (Lucknow the Garden of India)۔کہتے تھے۔شیشے اور ہاتھی دانت کے مکان ،شیر کی کھال کا شامیانہ، عالیشان عمارتیں بنوائیں ،جن کی برجیوں کے کلس اور گھڑیوں سے صبح کو سارا شہر چمک اٹھتا تھا۔

موسیقی کی گرم بازاری ہوئی۔کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں تھا، جو طوائفوں سے نہ بھرا ہو، سپہ گری، شہسواری، خطاطی بام عروج پر پہنچی ۔شعروشاعری کا چرچا زیادہ ہوا اور عام طور پر لوگوں میں اس کا مذاق پیدا ہوا۔

❁❁❁